اُردو ناول نگاری میں شعور کی رو کی اہمیت

ڈاکٹر جاوید بادشاہ*

Abstract:
"Stream of Consciousness" plays an effective and influencing role in "Novel Writing". This technique inspires readers towards the objectivity which the author wishes to convey. It reflects the images accordingly on the mirror of life. Thoughts, ideas and imaginations are oriented by this technique to streamline the other components of a novel. This trend has been adopted by Urdu novelist because of the western influence in literature. This technique i.e, "Stream of Consciousness" streamlines the thoughts of the readers and they pick the message of the author in an effective manner.

بیسوی صدی عیسوی میں جدید سائنسی نظریات نے جہاں انسان کی ذہنی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا وہاں اس میں کارل مارکس اور سگمنڈ فرائڈ کے علی الترتیب اشتراکی اور نفسیاتی اثرات کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔ ان نظریات نے انسانی سوچ وفکر کے قدیم سانچوں کو مسترد کر کے توڑ ڈالا۔ کارل مارکس نے جہاں ایک طرف انسان کے سیاسی و سماجی شعور کو نئی کروٹیں عطا کیں۔ وہاں سگمنڈ فرائڈ کے نظریات نے انسان کی نفسیاتی زندگی کی پیچیدگیوں اور گہرائیوں کو سلجھانے اور سمجھنے میں مدد دی۔ فرائڈ اور اس کے شاگردوں نے علم نفسیات کے جو نظریات پیش کئے ان کا دائرہ کار صرف علم نفسیات تک ہی محدود نہ رہا بلکہ ان نظریات نے مختلف مکاتب ہائے فکر کو بھی متاثر کیا جس میں ادب بھی شامل ہے۔ فرائڈ کے دریافت کردہ لاشعور کی بدولت ادب میں انسان کے اندر کی دنیاؤں کو باہر لانے کی کوشش کی گئی۔ یہ دریافتیں اتنی توانا تھیں کہ انہوں نے تمام اصنافِ ادب کو متاثر کیا۔ یہی دریافتیں مغرب میں مختلف فکری تحریکات کا موجب بھی بنیں۔ ڈاڈاازم اور سریلزم جیسی ادبی تحریکات کے پس پشت یہی نفسیاتی نظریات کارفرما تھے۔

مغربی ادب میں ناول کی صنف کو ایک اہم اور ممتاز مقام حاصل ہے۔ یہ صنفِ ادب بھی فرائڈ کے نظریات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ ناول جو کہ مخصوص اصولوں اور تکنیک کے ساتھ لکھا جاتا تھا۔ فرائڈ کے نظریات سے متاثر ہو کر اس میں ایک نئی تکنیک شعور کی رو (Stream of Consiousness) کا رواج عام ہوا۔ ناول جس میں معروضی دنیا کے نظارے واقعات کی صورت سامنے آتے ہیں۔ اس تکنیک کی بدولت اس صنف میں انسان کے اندر کی دنیا میں ہونے والی توڑ پھوڑ کو شعور کے بہاؤ کے ساتھ پیش کیا جانے لگا۔

* صدر شعبۂ اُردو، اسلامیہ کالج یونیورسٹی پشاور۔

شعور کی رو (Stream of Consiousness) ذہنی عمل کے بارے میں جدید نفسیات کا ایک تصور ہے جو علمی سطح پر امریکی ماہر نفسیات ولیم جیمز کی دریافت ہے۔ اس نظریئے کے مطابق انسانی شعور ایک سیال چیز ہے۔ انسانی ذہن میں مختلف تصورات، خیالات اور تاثرات ایک مسلسل رو کی شکل میں ابھرتے ہیں۔ ان خیالات، تاثرات اور تصورات میں بظاہر کوئی منطقی ربط نہیں ہوتا۔ انسانی ذہن کے پردے پر ماضی سے وابستہ یادیں، حال کے محسوسات اور مستقبل کے بارے میں ممکنہ خدشات اور توقعات بظاہر ایک غیر مربوط اور بے ہنگم طریقے سے نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ شعور کسی ذرا سی مناسبت کے سہارے یا اشارے کی مدد سے حال سے مستقبل یا ماضی میں، مستقبل سے حال یا ماضی میں، ماضی سے حال یا مستقبل تک جا پہنچتا ہے۔ کوئی شے کسی شخص، مقام یا واقعے کی یاد دلاتی ہے۔ کسی مقام کو دیکھنے سے یا اس کا ذکر کرنے سے کوئی شخص یا واقعہ ذہن میں ابھر آتا ہے یا کسی واقعہ کے ذکر سے کوئی شخص یا مقام شعور میں آداخل ہوتا ہے۔ اس طرح شعور کی رو بغیر کسی روکاوٹ کے اور بغیر کسی واضح منطقی ربط کے ہمارے ذہن کے پردے پر چلتی رہتی ہے۔

ناول نگاری میں جدید نفسیات کے اس تصور سے حقیقت نگاری کا یہ راستہ کھلا کہ ناول میں کرداروں کی زندگی، اعمال اور انکی سوچوں کو شعور کی رو کے حوالے سے یا اس کی مطابقت سے پیش کیا جائے۔ مغربی ادب ولیم جیمز، ڈورتھی رچرڈسن، ورجینا وولف اور ارنسٹ ہیمنگر وغیرہ نے جدید نفسیات کے اس تصور کو اپنے ناولوں میں ایک نئی تکنیک کے طور پر استعمال کیا۔ اس تکنیک کے بارے میں محمد احسن فاروقی لکھتے ہیں۔

> ''شعور کی رو والی ناول کا عام طریقہ یہ ہے کہ اس میں قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے۔ جیسے کہ کسی فرد کے دماغ میں تاثرات کی بے ہنگم دھار چل رہی ہو۔ اگر کوئی شخص اپنے ذہن میں آنے والے تمام خیالات کو جوں کا توں رقم کرتا چلا جائے تو ایسا گڑبڑ جھالا سامنے آئے گا جو کوئی سمجھ نہ سکے گا۔ مگر شعور کی رو والے ناول نگار اسی گڑبڑ اسی گڑبڑ جھالے کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اسکی بہترین مثال جیمز جوائس کی ''یولیس'' کا آخری باب ہے۔ جس میں 'میری بلوم' کے خیالات کی رو اس طرح رقم ہوئی ہے۔ کہ ایک جملہ بغیر کامے یا فل سٹاپ کے پینتالیس صفحوں تک چلتا ہے۔۔۔۔۔ اس سارے کھیل کا مقصد رو، دھار یا بے تکان حرکت کا تاثر قائم کرنا ہے۔''[۱]

ولیم جیمس خیال کو مسلسل تبدیلی کے پس منظر میں دیکھتا ہے اور اس کی مثال وہ دریا کے بہتے ہوئے پانی سے دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جس پانی میں ہم چھلانگ لگا کر باہر آجاتے ہیں۔ دوبارہ اسی پانی میں ہم چھلانگ نہیں لگا سکتے کیونکہ وہ پانی تو کب کا آگے بڑھ چکا ہوتا ہے۔ اس لئے وہ کہتا ہے۔ کہ زندگی بھی اسی طرح تجربات سے لبریز ہوتی ہے۔ جس کے سبب انسان کی نفسیاتی کیفیات میں تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے اور یہی تجربات محسوس یا نامحسوس سطح پر انسانی خیال میں بھی تبدیلی لاتے ہیں۔ اس لئے وہ ان تمام اصطلاحوں کو رد کرتا ہے۔ جن میں خیالات کے جڑے ہوئے ہونے کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ چونکہ ذہن میں خیالات کا بہاؤ دریا کی طرح مسلسل ہوتا ہے۔ اس لئے وہ ذہنی خیالات کے بہاؤ کے لئے شعور کی رو یا خیال کی رو یا داخلی زندگی کی رو کی اصطلاحیں استعمال کرتا ہے۔

شعور کی رو کی اصطلاح اگرچہ ولیم جیمز کی وضع کردہ ہے۔ مگر ''مے سنکلر'' نے جو کہ نفسیات کی طالبہ تھی۔ ۱۹۱۸ء میں پہلی مرتبہ ڈورتھی رچرڈسن کے ناول ''پلگرمیج'' (Pilgrimage) پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے استعمال کیا۔ ڈورتھی رچرڈسن کی ہم عصر ورجینا وولف نے اس تکنیک کو بڑے بھرپور انداز میں اپنے ناولوں میں پیش کیا۔

ناول میں شعور کی رو کی تکنیک میں آزاد تلازمہ خیال ''Free Association of Ideas'' کے اصول کو ملحوظ رکھنا ناگزیر اور لازمی ہوتا ہے۔ شعور کی رو یا شعور کی حرکت اور حالت کو قابو میں رکھنے کے لئے آزاد تلازمہ خیال کے طریقے کو کام میں لایا جاتا ہے۔ آزاد تلازمہ خیال کی مدد سے شعور کے بے روک بہاؤ میں ایک منطقی تسلسل پیدا کیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی ناول نگار آزاد تلازمہ خیال کی مدد سے اظہارِ ذات کا ایک نظام تشکیل دیتا ہے۔ جو کہ قاری کی فہم سے بالا نہیں ہوتا۔ آزاد تلازمہ خیال کے استعمال سے فائدہ یہ ہوتا ہے۔ کہ ناول نگار اسکے ذریعے شعور کا اظہار اس انداز سے کرتا ہے کہ کردار کے ماضی اور حال کے مختلف واقعات کو سامنے لاکر اسکی سوچ اور فطرت تک کو سامنے لے آتا ہے۔

شعور کی رو کی تکنیک والے ناول اپنے موضوعات، مقاصد یا تکنیک کے اعتبار سے آسانی کے ساتھ نہیں پہنچانے جاتے جبکہ وہ اپنے مواد کے اعتبار سے بہت آسانی سے پہنچانے جا سکتے ہیں۔ جن ناولوں میں یہ تکنیک استعمال ہوتی ہے۔ ان میں ایک یا ایک سے زیادہ افراد کے شعور کو پیش کیا جاتا ہے۔ یہ شعور اسکرین یا پردے کی صورت ہوتا ہے۔ جس پر درجہ بدرجہ مواد پیش کیا جاتا ہے۔

شعور کے رو کے تحت لکھے جانے والے ناولوں میں مختلف طریقے استعمال کئے جاتے ہیں۔ ان میں ایک نمایاں طریقہ'' اندرونی خودکلامی'' یا ''داخلی خودکلامی'' (Interior Monolouge) ہے۔ یہ طریقہ ناول

نگاری کے عام بیانیہ اسلوب سے مختلف ہے۔اس میں کردار خود کلامی کرتا ہے اور خود کلامی کے ذریعے کہانی کے پلاٹ کی مختلف جزٔیات قاری کے سامنے آتی جاتی ہیں۔اس طریقہ میں مختلف کردار اندرونی خود کلامی کے ذریعے فکری سطح پر اپنے نظریات،تصورات اور تاثرات بیان کرتے ہیں۔اس خود کلامی کا فائدہ ناول نگار کو یہ ہوتا ہے۔کہ وہ اس سے نہ صرف قاری کا تعارف کردار سے کروادیتا ہے بلکہ دوسرے کرداروں کے بارے میں بھی قاری کو جانکاری حاصل ہوجاتی ہے۔اندرونی خود کلامی کے لئے جملوں کی نحوی ترکیب کو بھی بدلا جاتا ہے۔تاکہ فطری خود کلامی کا تاثر پیدا کیا جاسکے۔

شعور کی رو میں ذہنی زندگی کی تصویر کشی کے لئے سنیما کا طریقہ جسے مانٹیج (Montage) کہتے ہیں استعمال کیا جاتا ہے۔اس میں دو مختلف زمانوں کی دو مختلف چیزیں دکھائی جاتی ہیں۔اسی طرح سنیما کے فن کے مختلف دوسرے طریقے بھی شعور کی رو میں استعمال کئے جاتے ہیں۔جیسے سنیما میں ایک واقعے یا منظر کو پیش کرنے کے بعد ایک بالکل مختلف واقعہ یا منظر کو پیش کیا جاتا ہے۔اسی طرح مانٹیج کے ذریعے شعور کی رو والے ناول میں یہی طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔اسی لئے بعض حضرات شعور کی رو والے ناول میں پلاٹ کے نہ ہونے کا فتویٰ صادر فرماتے ہیں۔دراصل جدید ناول میں ارسطو کے بتائے ہوئے پلاٹ کی تلاش کرنا اتنا ہی عجیب ہے جتنا سپر سانک طیارے میں ابتدائی زمانے کے ڈیزل انجن کی تنصیب۔کیونکہ ہم جب بھی شعور کی رو کی بات کرتے ہیں تو اس وقت اُس چست پلاٹ کی توقع نہیں کرنی چاہئے جس میں واقعات کا تسلسل زنجیر کی کڑیوں کی طرح ہو اور جس میں واقعات مربوط ہوں۔کیونکہ انسانی شعور کو کسی تسلسل یا منطقی ربط کی لڑی میں نہیں پرویا جاسکتا۔ایک اور بات بھی یہاں قابل ذکر ہے۔کہ جب کسی ناول میں پلاٹ کی عدم موجودگی کا شبہ ہو تو اُسے ناول ہی کیوں کہیں جبکہ ہم پلاٹ کو ناول کا بنیادی عنصر تسلیم بھی کرتے ہیں۔دراصل شعور کی رو والے ناولوں میں کردار کی نفسیات کو شعور کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ اجاگر کیا جاتا ہے۔اس لئے اکثر پڑھنے والوں کو پلاٹ کے مفقود ہونے پر شبہ ہوجاتا ہے۔

اردو ادب کی تاریخ کا جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آتی ہے۔کہ اردو ادب لسانی اعتبار کے ساتھ ساتھ صنفی اعتبار سے زبانوں فارسی اور انگریزی سے متاثر رہا ہے۔شروع میں اردو فارسی سے الفاظ و تراکیب اخذ کرنے کے علاوہ فارسی ادب میں مروجہ اصناف، بالخصوص شعری اصناف کو ان کے اصولوں سمیت اپنے اندر جذب کرنے کی کامیاب کوشش کی۔سرسید تحریک کی بدولت انگریزی زبان و ادب سے شناسائی کے بعد مختلف انگریزی اصناف ادب کا چلن اردو ادب میں عام ہوا،اس طرح اردو ادب عالمی ادب کی حیثیت اختیار کر گیا۔بعد میں مغرب میں اٹھنے والی مختلف ادبی تحریکوں کا اثر بھی اردو ادب میں نظر آنے لگا۔ناول نگاری میں شعور کی رو کی تکنیک کے حوالے سے مغربی

ادب میں بہت سے نام مل سکتے ہیں۔ جبکہ اردو ناول نگاری میں ہمیں یہ تکنیک صرف دو ناول نگاروں کے ہاں ملتی ہے۔ یہ ناول نگار سجاد ظہیر اور قرۃ العین حیدر ہیں۔

سجاد ظہیر کا ناول ''لندن کی ایک رات'' ۱۹۳۸ء میں منظر عام پر آیا۔ جبکہ اس سے دو سال پہلے پریم چند اردو ادب کو ''گئودان'' جیسا اہم ناول دے چکے تھے۔ جو اردو ناول نگاری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔'' لندن کی ایک رات'' میں پہلی مرتبہ شعور کی رو کی تکنیک استعمال کی گئی مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ اس ناول کو وہ حیثیت نہیں دی گئی جس کا یہ مستحق تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ناول کے بہت سے نقاد خود اس تکنیک سے واقف نہ تھے۔ سجاد ظہیر نے یہ ناول لندن سے تعلیم حاصل کر لینے کے بعد ہندوستان آئے ہوئے لکھا تھا۔ اس ناول میں صرف ایک رات کا ذکر ہے۔ مگر اس میں کردار بڑے بھرپور طریقے سے پیش کئے گئے ہیں۔ ناول نگار نے کمال مہارت سے کرداروں کی نفسیاتی حالت ان کے ماضی کے حالات کے ساتھ پیش کی ہے۔ اس ناول کا ہیرو نعیم جہاز میں شیلا گرین سے ملتا ہے اور اس کے حُسن سے مسحور ہوتے ہی نعیم کے شعور کی رو بہہ نکلتی ہے۔ اور مختلف خیالات اُس کے ذہن کے پردے پر نمودار ہونے لگتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

> ''آخر یہ کون ہے۔ کیا کرتی ہے۔ راؤ اسے کہاں ملا ہوگا۔ خوبصورت لڑکی ہے۔ خوبصورت۔ لیکن میں۔ مجھے کوئی خوبصورت کہہ سکتا ہے۔ مجھ پر کوئی لڑکی عاشق نہیں ہوئی۔ اس کی آخر کیا وجہ ہے۔ میں موٹا بہت ہوں۔ میرے اور اس کے درمیان میری توند حائل ہے معلوم نہیں یہ لڑکی مجھے کیسا سمجھتی ہے۔ توند سے کیا ہوتا ہے۔ اکثر دنیا کے بڑے انسانوں کو توندیں تھیں۔ لیکن اگر توند نہیں تو پھر کونسی چیز۔ شاید مجھے عورت سے بات کرنے کا سلیقہ نہیں۔ اب یہ لڑکی اتنی دیر سے یہاں ہے۔ اور مجھ سے ایک ٹھکانے کی بات نہیں کی جاتی۔ اپنے دل میں خیال کرتی ہوگی کہ کتنا غیر دلچسپ گھامڑ آدمی ہے۔ لیکن میں نے دیکھا ہے کہ ایسے لوگ جن سے دو لفظ بھی ٹھکانے سے بولے نہیں جاتے۔ عشق میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ پھر آخر مجھ میں کونسی کمی ہے۔ میرے دوست خیال کرتے ہیں کہ مجھے ان باتوں سے دلچسپی ہی نہیں۔ اچھی صورت دیکھ کر مجھ پر ذرا اثر نہیں ہوتا۔ غلط۔ بالکل غلط۔ ''مرا درد یست اندر دل اگر گویم زبان سوزد'' [۲]

مندرجہ بالا اقتباس میں آزاد تلازمہ خیال کا طریقہ استعمال کیا گیا ہے۔لڑکی کی خوبصورتی کو دیکھتے ہی نعیم اپنی شخصیت کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔اس کو اپنے رویے اور اپنے بارے میں دوستوں کی رائے اس کے شعور میں آتی ہے۔ یہ اقتباس کافی طویل ہے جس میں آزاد تلازمہ خیال کا یہی سلسلہ چلتا ہے اور ماضی ، حال، مستقبل تینوں زمانوں کو سمیٹتا ہوا نعیم کے کردار سے قاری کو مکمل طور پر آگاہ کر دیتا ہے۔

داخلی خود کلامی (Interior Monolouge) کے طریقے کو بھی سجاد ظہیر نے اپنے ناول ''لندن کی ایک رات میں استعمال کیا ہے۔ ناول کے ایک کردار اعظم کی خود کلامی کافی طویل ہے۔جس میں ''جین'' کے ساتھ اُس کے تعلقات کی نوعیت واضح ہو جاتی ہے اس خود کلامی کے ذریعے جو خیالات اعظم کے ذہن میں ابھرتے ہیں۔ان سے اس کے ذہن کی پوری ڈرامائی کیفیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

لندن کی ایک رات میں سجاد ظہیر نے شعور کی رو کی تکنیک جیمس جوائس کے ناول ''یولیس'' سے متاثر ہو کر استعمال کی۔اگر چہ اس ناول میں یہ تکنیک ''یولیس'' میں موجود تمام تر باریکیوں اور نزاکتوں کے ساتھ استعمال نہیں ہوئی مگر اس کے باوجود یہ ناول جدید ناول نگاری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

مغربی ادب میں جو مقام ناول نگاری میں ورجینا وولف کو حاصل ہے۔اردو ناول نگاری میں وہی مقام قرۃ العین حیدر کو حاصل ہے۔جس طرح لندن کی ایک رات میں سجاد ظہیر جیمس جوائس سے متاثر نظر آتے ہیں۔اسی طرح قرۃ العین حیدر ورجینا وولف سے متاثر نظر آتی ہے۔ بقول احسن فاروقی '' قرۃ العین حیدر نے ورجینا وولف کا بہت اچھا مطالعہ کیا ہے۔'' [۳]

''قرۃ العین حیدر نے'' میرے بھی صنم خانے'' کو جس میں شعور کی رو استعمال کی گئی ہے۔۱۹۴۷ء میں مکمل کیا۔اس تکنیک نہ سمجھنے کی بناء پر بہت سے اعتراضات کئے گئے اس سلسلے میں جلال الدین احمد کا بیان ملاحظہ کیجئے۔

''قرۃ العین کی دنیا سایوں'' گمبھیر تاؤں، پر چھائیوں، مبہم تصورات اور یک رخے خاکوں یا سلہٹوں کی دنیا ہے۔۔۔۔۔ان کے یہاں ہر چیز اسٹیج پر عکس کی طرح نمودار ہوتی ہے۔دھندلا ہٹوں میں کھوئی ہوئی اور اسی طرح سے گذر بھی جاتی ہے۔۔۔۔فرض زندگی سے لے کر موت تک ہر چیز قرۃ العین کے صنم خانے میں سایوں کی طرح چلتی ہوئی آتی ہے۔اور سایوں کی طرح گذر جاتی ہے۔پر اسرار، نا قابل فہم غیر واقعی، خیال انگیز، خیال فریب''۔[۴]

اس کے برعکس جدید ناول نگاری کو مدنظر رکھا جائے تو قرۃ العین کے ناولوں کا قد دوسرے ناولوں سے نکلتا ہوا نظر آتا ہے۔سجاد ظہیر نے ناول نگاری میں جو بنیاد رکھی تھی۔قرۃ العین نے اسی پر ایک خوبصورت محل تعمیر کر دیا۔ان

ناولوں میں صرف شعور کی رو کی تکنیک کو ہی نہیں برتا گیا۔ بلکہ دوسرے جدید مغربی رجحانات کو بھی انہوں نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ نبھایا تھا۔ دراصل قرۃ العین روایت کی غلام نہیں ان کے ناولوں کی بنیاد جذبات واحساسات کی پیشکش پر ہے۔ اگر ہم ان کے ناولوں میں ''مادیت'' یا ٹھوس یا واقعی انداز' جو روایتی ناولوں کا ہوتا ہے۔ تلاش کرتے ہیں۔ تو یہ ہماری بھول ہوگی۔ کیونکہ وہ تو مختلف تجربات کو مختلف رنگوں میں پیش کرنے والی فنکارہ ہیں۔ وہ اپنے ناولوں میں یہ بات پیش کرنا چاہتی ہیں۔ کہ زندگی کس طرح انسانی شعور کو متاثر کرتی ہے۔

قرۃ العین حیدر نے آزاد تلازمہ خیال کے طریقے کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنے ناولوں میں برتا ہے۔ ''میرے بھی صنم خانے'' سے ایک اقتباس اس سلسلے میں پیش خدمت ہے۔

''اس کی جھکی ہوئی کالی پلکیں دیکھ کر دفعتاً رخشندہ کو بڑی تکلیف دہ شدت سے کوئی بہت پرانی یاد آ گئی۔ قمر آراء کی آنکھیں، خورشید کی آنکھیں متجسس خوفزدہ، وحشی کالی آنکھیں، اُن آنکھوں نے کہا تھا کہ ہمیں بہت جلد تم بھول جاوگی۔ اس لئے رنجیدہ زیادہ نہ ہو۔ وہ زیادہ کیا ذرہ بھی رنجیدہ نہ ہوئی تھی۔ حالانکہ خورشید مدتوں سے غائب تھا۔ خورشید جو کانپور میں مزدوروں کے ساتھ رہتا تھا۔ مئی اور جون کی گرمیوں میں ٹین کے تپتے سائبانوں کے نیچے لیٹتا تھا۔ نل کا گرم پانی پیتا تھا۔ اور ترقی پسند شاعری کرتا تھا۔ [۵]

اس اقتباس میں ملاحظہ فرمایئے کہ کس چابکدستی کے ساتھ آزاد تلازمہ خیال کا طریقہ فطری انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ قمر آراء کی آنکھوں سے گریز کرتے ہوئے۔ رخشندہ کو خورشید کی آنکھیں یاد آتی ہے۔ اور پھر چند جملوں میں خورشید کا تعارف بھی کرادیا جاتا ہے۔ کہ ایک پڑھا لکھا نوجوان جو اپنی محبت کو چھوڑ کر ترقی پسند تحریک میں شمولیت اختیار کر لیتا ہے۔ اسے اپنے نظریئے سے Commitment کی وجہ سے کتنی تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ یہ سب کچھ آزاد تلازمہ خیال کے طریقے سے ہمارے سامنے لایا گیا ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کر دیا گیا ہے۔ شعور کی رو کی تکنیک میں سنیما کے مختلف طریقے بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے بھی اپنے ناولوں میں Mantage کے طریقے کو استعمال کیا ہے۔ اس طرح وہ بہ یک وقت دو مختلف منظروں کو ایک ساتھ دکھاتی ہیں اس سلسلے میں ''میرے بھی صنم خانے'' سے دو مختلف منظروں کے کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

''ان چاروں کا دل چاہ رہا تھا۔ کہ بہت سی باتیں کریں۔ لیکن اتنی ڈھیروں باتیں تھیں کہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کہاں سے شروع کریں۔

اپنے جھولتے ہوئے صوفے پر سے اُتر کر کنور صاحب نے قانونِ شیخ ہند کی اور لالہ اقبال نارائن کو بلانے کے لئے گھنٹی بجائی۔''

مندرجہ بالا اقتباس ''میرے بھی صنم خانے'' سے لیا گیا ہے۔ پہلی دو لائنوں میں پیچو اپنی بہن اور دو سہیلیوں کے ساتھ پہلے منظر میں موجود ہے۔ جبکہ دوسرے اقتباس میں جو کہ پہلے منظر سے فوراً بعد کا ہے، کنور کشور صاحب کو منظر میں لایا گیا ہے۔

شعور کی رو والے ناولوں میں وقت کی بہت زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ کیونکہ ان مختلف طریقوں سے ماضی، حال اور مستقبل کو باہم متوازی انداز میں چلایا جاتا ہے۔ قرۃ العین حیدر بھی وقت کی اہمیت کا پورا ادراک رکھتی ہیں۔ ان ناولوں میں بالخصوص ''آگ کا دریا'' میں وقت ہی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ وقت کو اس ناول میں ایک اکائی کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ وقت انسان میں کن کن تبدیلیوں کا باعث بن سکتا ہے۔ یا وقت انسان کے اجتماعی لاشعور کو کس طرح اور کس انداز میں بدلتا ہے۔ غرض قرۃ العین حیدر نے اپنے ناولوں میں وقت کی ماہیت کو بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔

جہاں تک اس تکنیک کا اردو ناول میں چلن یا مستقبل کا تعلق ہے۔ تو مذکورہ بالا ناولوں کے علاوہ کسی اور ناول میں اس تکنیک کو نہیں برتا گیا۔ دراصل اول تو بجائے خود ناول ایک مشکل صنف ادب ہے۔ جو موضوع سے لیکر جملہ تکنیکی عناصر تک گہری ریاضت کا متقاضی ہے۔ ناول نگار بڑی مشکل سے ناول کے جملہ تکنیکی عناصر کا تانا بانا بنتا ہے۔ مغربی ناولوں کے تتبع میں بہت سی تکنیک بشمول شعور کی رو اردو ناول میں استعمال تو کی گئیں مگر تجرباتی طور پر، کوئی بھی تکنیک مستقل طور پر اردو ناول میں جگہ نہیں پا سکی بالخصوص شعور کی رو۔ دوسرے یہ ہے کہ شعور کی رو تکنیکی اعتبار سے ایک مشکل تکنیک ہے۔ اس لئے ناول جیسی مشکل صنف میں اسے برتنا گویا کہ اپنی مشکل کو مشکل تر بنانے کے مترادف ہے۔ جس کے لئے مہینوں بلکہ سالوں کی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو غالباً اُردو ناول نگاروں کے لئے ممکن نہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر یوسف سرمست، 'بیسویں صدی میں اُردو ناول'، صفحہ ۳۲۴۔ ترقی اُردو بیورو نیو دھلی۔

۲۔ سجاد ظہیر، 'لندن کی ایک رات'، صفحہ ۳۳، ۳۴۔

۳۔ نقوش (لاہور) پنجسالہ نمبر فروری، مارچ ۱۹۵۳ء، ص ۱۵۴۔

۴۔ نقوش (لاہور) سالنامہ نمبر ۱۹۵۱ء، ص ۵۷

۵۔ قرۃ العین حیدر، 'میرے بھی صنم خانے'، ص ۹۳، ۹۴۔